خطوطِ اقبال بنام عطیہ فیضی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

KURF

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش

خطوطِ اقبال

بنام عطیہ فیضی

ترجمہ

ڈاکٹر منظر عباس نقوی

شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

عنوان کتاب: خطوطِ اقبال :بنام عطیہ فیضی.
ترجمہ:ڈاکٹر منظر عباس نقوی.
پیشکش،تہذیب ،سرورق و تمہید:ڈاکٹر محمد علی جنید.
بشکریہ:شعبہ اوردو:علیگڑھ مسلم یونیورسٹی :بھارت
صنف:اقبالیات.

اپنے مشفق و محترم بزرگ

پروفیسر خورشید الاسلام

کی خدمت میں

جن کی ذاتی توجہ، رہنمائی اور ہمت افزائی سے

اِن خطوط کی اشاعت ممکن ہوئی۔

تمہید

اقبال کو برصغیر پاک و ہند میں جو مقام حاصل ہے،اور انکو جو شہرت قدرت کی جانب سے عطا کی گئی ہے،وہ خود بذاتِ خود حیران کن امر ہے۔جہاں تک انکی شاعری کا تعلق ہے جو انکی اصل مقامِ شہرت ہے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں ہمیں نا ہی کوئی کلام ہے اور نا یہ خاکسار اس صنف کا کوئی ماہر ،متوالا،عاشق یا اس میں خاص دلچسپی رکھتا ہے۔جبکہ شاعر کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کی نثر و کلام یا انکے خطوط سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وہ خود کو شاعر اقبال کی جگہ،مفکر،فلسفی یا مجدد نما شہ ڈھکے چھپے الفاظوں میں تصور کیا کرتے تھے۔

جہاں تک انکی شاعری کا تعلق ہے اس نے ملت کو اوردو شاعری کے ضمن میں بہت متاثر کیا ہے،خصوصاً محفل کو گرمانے والے اور تقریروں میں اقبالی اشعار سے محفل گرمنے والوں کو تو کافی متاثر کیا ہے ۔اگر چہ اس تاثر یا انکی شاعری سے متاثر ہونے نے کلامی سے زیادہ کوئی عملی کام کم ہی کیا ہے،کیونکہ شاعری میں معنی و تعبیر کی راہیں اسکے اختصار اور اجمال کے سبب بہت وسیع ہوتی ہیں،ہر فرد و ادارہ اپنے اپنے ذہنی خاکوں،خواہشوں،داخلی موضوعیت کے تناظر میں اسکی تشریح و توضیح کرتا نظر آتا ہے،اہل علم نے اس شاعری کی تشریح و توضیح،میں اتنا کام کیا کہ اقبالیات کا نیا دایرہ کار قایم ہوگیا ہے ،جسکی کوکھ سے ہزاروں کتب نے دنیا بھر میں جنم لیا ہے ۔

ہم غور کرتے ہیں کہ انکی اوائل شاعری میں انکے رجحانات و میلانات،ماحول اور معاشرے سے میل کھاتی نظر نہیں آتی ہے،اس دور میں وہ کئی مسایل کا شکار نظر آتے ہیں غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ انکی دلچسپی کا محور خواتین اور وہ بھی اعلی طبقہ کی خواتین یا علمی استعداد کی حامل خواتین ہوا کرتی تھیں۔

انکی حیات کا یہ پہلو ۱۹۱۴ تک تو بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے،جس سے ایک جدید الخیال ماڈرن مسلم تو خوش ہوسکتا ہے مگر انکا وہ پیروکار ،جو انھیں عالم،مولوی،،پیر یا ولی مانتا ہے وہ ان سب آثار و روایات سے حیران و پریشان ضرور ہوسکتا ہے، ہمیں انکی اولین حیات کے ادوار میں جھانکنے سے

یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پہلی بیوی کے ساتھ قطعاً خوش نا تھے،جبھی اس تلخی نے انکو دوسری خواتین کی طرف راغب ضرور کیا تھا مگر،ہمیں انکی بابت کوئی منفی فعل اور خبر مصدقہ طور پر حاصل نہیں ہوسکی ہے جو الزام تراشی قایم کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوسکے،انکو انکے جدید مخالفین نے تحقیق کے نام پر عورت و شراب کا جیسا عاشق بیان کیا ہے،وہ کم علمی کے ساتھ زیادتی پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے،چناچہ میں پھر کہونگا کہ میری تحقیق اور معلومات کی رو سے انکے پاس اقبال کی نجی زندگی پر دشنام طرازی تھونپنے کے ضمن میں کوئی مستند سند اور بنیاد موجود نہیں ہے۔

اقبال کی عورتوں سے خطوط نویسی،ملاقاتیں کوئی ہجرے،اور خلوت کی قسم کی شہ نہیں تھیں جبکہ وہ خواتین اس دور کی سیاسی ،علمی سنگتوں میں کافی معروف تھیں ،اور صرف اقبال یا شبلی نما حضرات کے ان موصوفاوں سے خاص تعلقات نا تھے بلکہ ان محفلوں میں عامتہ الناس و خاص کی بڑی تعداد بھی ان حضرات کے ساتھ ساتھ وہاں موجود ہوا کرتی تھی،گھروں پر آنے جانے میں بھی اُن خواتین کے اہل خانہ انکے ساتھ ساتھ ملاقاتوں میں پائے جاتے تھے، مزید براں انکی گفتگوئیں بھی زیادہ تر شاعری،سیرت،تاریخ،سیاست و ریاست کے گرد گھوما کرتی تھیں۔اس دور کی مسلم بیداری میں شریک مسلم خواتین بھی رسم و رواج اور دیسی معاشرت کی پابند ہوا کرتی تھیں،اکثر ایسی دلچسپیاں پردے یا ہجرے کے پیچھے سرانجام دیا کرتی تھیں،اختلاط کی وہ نوعیت و کیفیت نہیں تھی جیسی آج کل غالب ہے۔

عطیہ فیضی اس دور کے لحاظ سے ایک جدید،ماڈرن خاتوں ضرور تھیں مگر انھیں ہم،آج کی کراچی،لاہور کی سیاستِ نسا میں معروف حقوقِ نسوں کی دلدادہ کراچی،لاہور،اسلام آباد کی خواتین کی جدیدیت پر قیاس نہیں کرسکتے ہیں۔

بحرحال اقبال صاحب نے تین شادیاں کیں جو اس بات کا مظہر ہے کہ وہ حلال و جایز زن و شو کے تعلقات پر یقین و اعتقاد رکھتے تھے،عطیہ کی طرف انکا اگر جھکاو تھا تو وہ ایک دور دراز کی خطوطی دوستی کا تعلق تھا،جن سے کبھی کبھار کسی محفل میں یا کبھی دیار غیر میں انکے سیاسی ، و علمی پس منظر کے سبب سامنا ہوجایا کرتا تھا،علیک سلیک ہوجایا کرتی تھی۔اقبال کا یہ دور قنوطیت وبےچینی،کا دور تھا۔

یہ قنوطیت یہ اداسی،یہ اندر کی قلبی بے چینی گھریلو بھی تھی اور ملی بھی تھی،کاروباری بھی تھی اور شاعرانہ بھی تھی۔اصل میں ہم شخصیت پرستی کے ایسے اثیر ہوچکے ہیں کہ بلا مطالعہ و تحقیق کسی جز پر پوری عمارت کھڑی کرکے خود کو محقق کامل تصور کرنے لگتے ہیں۔ہم افراط و تفریط میں حق کا دامن جا چھوڑتے ہیں۔

ہمیں ہر فرد ،ہر ہیرو،ہر پسند اور ناپسند کو اسکے اصل مقام تک محدود رکھنا چاہئے،جب ہم اقبالؒ اور انکی مثل شخصیات کو دل کے مندر خانے میں سجا کر پییغمبروں،صحابہ کرام،تابعین،تبع تابعین،محدثین،آیمہ کرام اور علمائے دین کے مقام کی طرح پوجنے لگیں یا انھیں معصوم الفطرت جاننے لگیں تو ہماری انا آزاد تحقیقات کے سامنے مجروح ہوتی چلی جاتی ہیں اور ہمارے لبوں پر محققین کے لئے گالیاں نکل نکل کر پسھلتی رہتی ہیں۔

ہم تحقیق کی جگہ عامتہ الناس میں مشہور تصورات،اور عقیدوں کو ایمانیات میں شامل کرلیتے ہیں یوں معاملات بگڑ جاتے ہیں۔ ہمیں تسلیم ہے کہ اقبال ایک اعلی شاعر تھے،مگر اگر آپ انکو کسی محدث،فلسفی،مورخ۔مفسر اور فقیہ کی طرح عالم،فاصل،علامہ ماننے لگیں گے ،یا انھیں ولی،نما شہ مانکر سفر کرنا شروع کرینگے تو مستقبل میں آپکے قدم قدم پر منہ کے بل گرنے کے امکانات لازماً موجود رہینگے۔

ہماری ریاست نے دیگر اقوامِ عالم کی پیروی میں قومی ہیروں کے کردار و افکار کی من چاہی تعمیر سے حق کو پس منظر میں جیسے تیسے روانہ کیا ہے اس نے مطالعہ پاکستان اور اوردو ادب کی چھتری کو آخری میدان حق و باطل قرار دیکر حقیقت کی تلاش کو عامتہ الناس کے لئے مشکل بنادیا ہے۔

وہ اقبال جو شاعری میں نظر آتا ہے اور وہ اقبال جو عقیدت مندوں کی تحریروں میں دکھتا ہے ،وہی اقبال جو شاعری کی قدامتی اقدار میں قدامت پسند دکھتا ہے جب وہ ہی اقبال آخری دور میں سیاست و علم کلام میں قدم رکھتا ہے تو اسکی ساری کلامی و فلسفیانہ علمیت بکھرنے لگتی ہے وہ اب جدید الفکر معتزلی ،حدیث گریز مسلم طبقے کو محبوب لگنے لگتا ہے۔

اقبال کے خطبات ہی اصل میں انکی واضح اور آخری عشرے کی تصنیف ہے،جسے چھاپنے،انکی تصحیح کرنے،ان پر علما ،محققین اور اہل علم کے

اعتراضات نے انھیں تردد کا شکار کردیا تھا،خوفزدہ کردیا تھا،انکے استاد و مرشد سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ جیسی قد آور شخصیات کے ان پر اعتراضات،ان کے افکار پر ان سے خط و کتابت ڈھکی چھپی نہیں ہے، امالی غلام محمد اس ضمن میں کام کی شہ ہیں،سہیل عمرصاحب وغیرہ نے بھی اس ضمن میں کافی کام کیا ہے ۔مسلم جدیدیت کے ماہر سید خالد جامعی کی تحریروں سے بھی یہ امر واضح ہے۔

باقی اقبال کی نجی زندگی انکا ذاتی معاملہ ہے اس ضمن میں کوئی خاص تنقیدی بات کرنا ضروری محسوس نہیں کرتا ہوں،کیونکہ سیاسی ،تاریخی اور مذہبی تحقیق میرا اصل میدان ہے اور میں اقبال کی فکر کا عموماً انھی تناظر میں جایزہ لینا پسند کرونگا،ادب کی نزاکتیں اور باتیں اوردو یا فارسی کے محققین جانیں۔

یہ تصنیف اول شعبہ اوردو،علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے چھپی تھی،جسکا انگریزی سے اوردو ترجمہ شعبہ کے استاد ڈاکٹر منظر عباس نقوی صاحب نے فرمایا تھا۔جسے میں نے بس تہذیب و تصاویر کے اضافے کے ساتھ قارین کی خدمت میں پیش کردیا ہے، یہ بلخصوص میرے اُن طلبہ کے لئے جو مجھ سے ،سیاست ،تاریخ پاکستان،مطالعہ پاکستان اور مسلم فلسفہ پڑھتے ہیں انکے لئے خاصی دلچسپی کا سامان ہوگی۔

ڈاکٹر محمد علی جنید

فہرست

تعارف

> "خانگی خطوں میں، اور خاص کر اُن خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے، جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی۔ اِن کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے۔ تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا، گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے جہاں اندیشۂ لائم نہیں ہے۔ یہ دلی خیالات اور جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔ پھر کون ہے جو اس خاموش آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا۔[1]"
>
> (مولوی عبدالحق)

یہ تھی وہ "خاموش آواز" جو پیکرِ الفاظ میں ڈھل کر خطوطِ شبلی بن گئی۔ میری مراد ہیں علامہ شبلی نعمانی کے عطیہ فیضی کے نام وہ دلچسپ اور دل آویز خطوط جن کو پروفیسر خورشید الاسلام نے اپنے ایک مضمون میں "خاصے کی چیز"[2] بتایا ہے۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ان خطوط نے تاریخِ نثرِ اردو میں ایک رومان انگیز باب کا اضافہ کر دیا۔

۱۔ مقدمہ: خطوطِ شبلی: صص: ۱۴۔ ۲۔ تنقیدیں: صص: ۵۱۔

اقبالؔ کے زیرِ نظر خطوط بھی انہی عطیہ فیضی کے نام ہیں۔ سب سے پہلی بار ان خطوں کا عکس، جو کہ اصلاً انگریزی میں ہیں، عطیہ بیگم کے اُس کتابچے میں چھپا جو فروری ۱۹۴۷ء کو بزبانِ انگریزی اکیڈمی آف اسلام (انٹرنیشنل) کے سلسلۂ مطبوعات کے تحت بمبئی سے شائع ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد، بدقسمتی سے کچھ سیاسی غلط فہمیوں کی بنا پر اقبالؔ کے سلسلے میں جو افسوسناک تبدیلی ہمارے رویّے میں واقع ہوئی اُس کے نتیجے میں اقبالؔ جس گلستاں کا بلبل تھا وہیں بیگانہ قرار دے دیا گیا۔ ان حالات میں، ظاہر ہے کہ عطیہ بیگم کے اِس کتابچے کی طرف کس کی نظر جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمہ تو درکنار ابھی تک یہ خطوط ٹائپ میں بھی شائع نہیں ہو سکے۔ سنا ہے کہ پاکستان میں شائع ہو گئے ہیں۔ اغلب ہے کہ وہاں ان کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو چیز دستیاب نہیں ہمارے لئے اُس کا عدم و وجود یکساں ہے۔ عطیہ بیگم نے اِس کتابچے میں خطوط کے عکس کے ساتھ ساتھ اقبالؔ سے اپنے دوستانہ مراسم کی جو تفصیل دی ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی ——— دلچسپ، عام قاری کے لئے اور مفید، ادب کے اُن طالب علموں کے لئے جو اقبالؔ کی حیات اور شاعری کا خصوصی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

عطیہ بیگم کون تھیں؟ اِس سلسلے میں فی الحال اتنا جاننا کافی ہوگا کہ وہ بمبئی کے اُس متمول اور ممتاز فیضی خاندان کی چشم و چراغ تھیں جو تعلیم اور روشن خیالی کے نقطۂ نظر سے ہندوستانی مسلمانوں میں بہت پیش پیش تھا۔ اُن کے والد حسن آفندی صاحب ایک بڑے تاجر تھے جن کا قیام بسلسلۂ تجارت کئی سال تک استنبول (ترکی) میں رہا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ ۱۸۹۲ء میں مولانا شبلی بلادِ اسلامیہ[1]

[1] خطوطِ شبلی۔ ص ۱۰

پیش آتی تھیں، اس لئے اُن کے حکم کی تعمیل ضروری ہو گئی۔
کھانے کی میز پر میں نے اقبال کو فارسی، عربی اور سنسکرت
کا عالم پایا اور ایک ایسا ظریف اور حاضر جواب انسان جو کسی کی
کمزوری سے فائدہ اٹھانے اور حاضرینِ محفل پر پھبتی کسنے
سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔ اقبال کے پہنچنے سے پہلے ہی مس
بیک نے مجھ پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ خاص طور پر
مجھ سے ملنے کا خواہشمند ہے۔ چنانچہ میں نے بھی لگی لپٹی نہ
رکھتے ہوئے بڑی بے باکی کے ساتھ اقبال سے پوچھ ہی لیا
کہ آخر وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا: "آپ
اپنے سفرنامے کی بدولت ہندوستان اور لندن میں بہت
مشہور ہو گئی ہیں، اسی وجہ سے میں آپ سے ملنے کا مشتاق
تھا۔" اُس وقت اُن کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے نہ
کسی قسم کے طنز کا اظہار ہوتا تھا اور نہ تعریف کا۔ میں نے
اُن سے کہا کہ میں یہ ماننے کے لئے تو ہرگز تیار نہیں کہ محض یہ
خراجِ تحسین ادا کرنے کے لئے آپ نے کیمبرج سے یہاں تک آنے
کی زحمت گوارا فرمائی ہے —— خیر یہ تو مذاق کی بات تھی، اب
آپ یہ فرمائیں کہ آپ کا حقیقی منشا کیا ہے؟ میرے اس
اکھڑ پن پر وہ کچھ حیرت زدہ سے رہ گئے اور انھوں نے کہا۔
"میں سید علی بلگرامی اور اُن کی بیگم صاحبہ کی جانب سے
اس کام پر مامور کیا گیا ہوں کہ آپ کو اُن کی مہمان کی حیثیت
سے کیمبرج آنے کی دعوت دوں۔ میرا فریضۂ منصبی یہ ہے کہ

بہرحالت میں آپ کی رضامندی حاصل کروں۔ اگر خدانخواستہ
آپ نے انکار کر دیا تو مجھ پر ناکامی کا داغ لگے گا جو میں نے
کبھی گوارا نہیں کیا ——— اور اگر آپ نے دعوت منظور فرمالی
تو یہ میزبانوں کی عزت افزائی ہوگی۔[1]

یہ تھی اقبال کی عطیہ فیضی سے وہ پہلی ملاقات جس سے دوستانہ روابط کا آغاز ہوا۔ چند ہی روز بعد اقبال نے عطیہ کو لندن کے ایک ریستوراں میں ڈنر پر مدعو کیا۔ جس میں انھوں نے اُن جرمن طلبا کو بھی بلایا جو اُن کے ساتھ تحقیقی کام کر رہے تھے۔ دعوت کا اہتمام بڑی نفاست اور خوش سلیقگی سے کیا گیا تھا جس سے عطیہ بیگم بہت متاثر ہوئیں اور جب انھوں نے اقبال کے حسنِ انتظام اور خوش ذوقی کی داد دی تو اقبال نے کہا: "میری ذات دو شخصیتوں سے مرکب ہے ——— ایک خارجی، جو عملی اور کاروباری ہے، اور دوسری داخلی، جو تخیّل پرست، مفکّر اور صوفیانہ ہے۔"[2] اس دعوت کے جواب میں عطیہ نے ۱۰ر اپریل کو اقبال کے اعزاز میں ایک مختصر سی چائے کا اہتمام کیا جس پر اپنے چند احباب کا اقبال سے تعارف کرایا۔ یہ صحبت بھی بڑی پُرلطف رہی۔

۲۲ر اپریل ۱۹۰۷ء کو، جیسا کہ عطیہ بیگم آگے چل کر لکھتی ہیں، مقررہ پروگرام کے مطابق وہ اقبال اور شیخ عبدالقادر کے ہمراہ کیمبرج کے لئے روانہ ہوئیں۔ راستے بھر اقبال اور شیخ عبدالقادر مختلف مباحث پر گفتگو کرتے رہے جس میں علمیت کے ساتھ ساتھ مزاح اور ذہانت کی چاشنی بھی کم نہ تھی۔ دوپہر ہوتے ہوتے یہ لوگ سید علی بلگرامی صاحب کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ تعارف کی تقریب اقبال نے انجام دی اور اس ڈھنگ سے انجام دی گویا میزبانوں کو عطیہ فیضی کے روپ میں کوئی مقدس تحفہ

[1] اقبال (انگریزی)، ص ۱۴ [2] ایضاً، ص ۱۵

پیش کر رہے ہوں۔ انھوں نے کہا: "زندگی بھر میں اگر مجھے کبھی ناکامی کا اندیشہ ہوا ہے تو وہ بس مس فیضی سے سابقہ پڑنے پر ہوا۔ بہرطور انھوں نے محض آپ دونوں کے پاسِ خاطر سے دعوت نامہ مسترد نہ فرماکر مجھے ناکامی سے بچالیا۔"[1] اس صحبت میں چند دوسرے احباب بھی شریک تھے۔ شام تک بڑا پُرلطف وقت گزرا۔

غرض ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۲۰ جون ۱۹۰۷ء کو مس شولی نامی ایک جرمن خاتون نے عطیہ بیگم کو رات کے کھانے پر مدعو کیا جس میں ہندوستانی کھانوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ عطیہ مس شولی کے مکان پر پہنچیں تو پتا چلا کہ انھیں اس دعوت میں اقبال ہی کے ایما پر مدعو کیا گیا ہے۔ انھیں یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ اس دعوت کے لئے تمام کھانے اقبال ہی کی ہدایت اور نگرانی میں تیار ہوئے تھے۔ اقبال نے عطیہ بیگم کو بتایا کہ وہ ہر قسم کے ہندوستانی کھانے خود پکا سکتے ہیں لیکن دراصل اُن کو اس موقع پر مدعو کرنے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ انھیں دنوں اقبال نے اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اُسے اوّل سے آخر تک پڑھ کر عطیہ بیگم کو سنائیں۔ چنانچہ عطیہ بیگم کا بیان ہے کہ اقبال نے اس صحبت میں اپنا پورا مقالہ پڑھا جس سے اُن کی دقّتِ نظر اور تلاش و تحقیق کا اندازہ ہوتا تھا۔ مقالہ ختم کرنے کے بعد انھوں نے عطیہ بیگم سے مقالے پر تبصرے کی فرمائش کی اور عطیہ نے جو جو مشورے دئے وہ اُن کو اپنے مقالے میں شامل کرنے کے لئے ایک کاغذ پر نوٹ کرتے گئے۔ اس واقعہ کی ایک سے زیادہ تفسیریں ممکن ہیں، لیکن بظاہر دو ہی نتیجے نکلتے ہیں ــــــ ایک عطیہ فیضی کی غیرمعمولی علمیت اور ذہانت، اور دوسرے اقبال کی طرف سے اُس کا فراخدلانہ اعتراف۔ غرض اِن دوستانہ روابط نے رفتہ رفتہ ایک ایسی رفاقت کی شکل اختیار کرلی جس میں "من تو شدم، تو من شدی" کی شان پیدا

[1] اقبال از عطیہ بیگم، ص ۱۹

ہو جاتی ہے، جیسا کہ ایک خط میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں:

> "آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کوئی بات راز نہیں رکھتا۔ میرا ایمان ہے کہ ایسا کرنا گناہ ہے۔"

(مکتوبِ اقبال مورخہ ۷ اپریل ۱۹۰۹ء)

ایک اور خط سے بھی اسی قسم کے پرخلوص اور رازدارانہ روابط کی توثیق ہوتی ہے۔ یہ وہ خط ہے جس میں اقبال نے اپنی ازدواجی زندگی کی تلخیوں اور اپنی ذاتی محرومیوں کا بیان بڑے ہی جذباتی انداز میں کیا ہے۔ چنانچہ اپنے غم و غصے کا اظہار کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> "براہِ کرم مجھے اس یاوہ گوئی کے لئے معاف فرمائیے گا۔ میں ہمدردی کا طالب نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں۔ آپ کو میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ اسی سبب سے میں نے اپنے جذبات کے اظہار کی جرأت کی ہے۔ یہ راز کی بات ہے۔ براہِ کرم کسی سے کہیئے گا نہیں!"

(خط مورخہ ۹ اپریل ۱۹۰۹ء)

عطیہ بیگم ایک عرصے تک اپنے عزیز دوست کے ان "رازوں" کو سینے سے لگائے رہیں، اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں (یعنی اقبال کے انتقال کے کم و بیش نو سال بعد) جب انھیں یہ یقین ہو گیا کہ اقبال کی عظیم شخصیت کو ان چھوٹی موٹی باتوں سے کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا تو انھوں نے یہ مقدس امانت علمی دنیا کے حوالے کر دی۔ خدا انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان خطوں میں ہمیں جا بجا ایسے نئے حقائق اور مفید اشارے ملتے ہیں جن سے برِصغیر کے اس عظیم المرتبت شاعر اور مفکر کی شخصیت، شاعری اور ذہنی ارتقا کی ایک بہتر تفہیم میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

اسی اہمیت کے پیشِ نظر ان انگریزی خطوط کو اردو میں منتقل کرکے ضروری تشریحات کے ساتھ اُردو داں طبقے کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہاں ایک اعتراف ضروری ہے۔ صاحبانِ نظر کو ترجمے کی کوتاہ دستیوں اور نارسائیوں کا پورا اندازہ ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک زبان کے مطالب کو دوسری زبان میں تمام و کمال ادا کرنا دشوار ہی نہیں منجملہ محالات ہے۔ پھر اقبال جیسے صاحبِ قلم کی انگریزی تحریریں اور مجھ ایسے کم سواد کا ترجمہ۔ لیکن صرف اِس خیال سے یہ بارِ گراں اٹھانے کی جسارت کی کہ وہ حضرات بھی جو انگریزی زبان سے واقف نہیں ہیں حضرت علامہ کے اِس بیش قیمت ذہنی سرمائے سے محروم نہ رہیں۔ نہیں کہہ سکتا کہ اِس ذمہ داری سے کہاں تک عہدہ برآ ہو سکا ہوں۔ بہرصورت میری یہ کوشش ضرور رہی ہے کہ اِس ترجمے کو جہاں تک ہو سکے اقبال کی اُردو تحریروں کا ہم آہنگ بنا دیا جائے۔ اِسی لئے اکثر مواقع پر اُردو کے سہل اور روزمرہ بولے جانے والے الفاظ کے مقابلے میں فارسی کے نسبتاً مشکل اور نامانوس الفاظ کو ترجیح دینا پڑی ہے، اور یہ اقبال کے نثری اسلوب کی وہ خصوصیت ہے جس کا اندازہ اُن کے اردو مکاتیب سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ترجمہ کرتے وقت ایک دشواری کا اور سامنا ہوا اور وہ یہ کہ انگریزی (You) کے لئے کونسی ضمیر اختیار کی جائے، "آپ" یا "تم"؟ ظاہر ہے کہ جو احساسِ قرب "تم" میں ہے وہ "آپ" میں نہیں۔ شاید اِسی لئے مولانا شبلی نے تو عطیہ بیگم کو اپنے ایک ابتدائی مراسلے ہی میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ "معاف کیجئے، میں "آپ" کے بجائے "تم" کا لفظ لکھوں گا۔ "آپ" کے لفظ میں بیگانہ پن ہے"[1]۔ میں نے بہت کوشش کی کہ عطیہ بیگم کے نام اقبال کا کوئی اُردو خط مل جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اُن سے تخاطب میں وہ کونسا لفظ استعمال کرتے تھے، لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود

[1] خطوطِ شبلی۔ ص ۴۲

مجھے کوئی اُردو خط دستیاب نہ ہو سکا، البتہ ایک نظم کے حاشیے پر، جو اقبال نے عطیہ بیگم کو بھیجی تھی۔ یہ نوٹ اُردو میں دیا ہوا ہے:

> "مسز نیڈو صاحب کی خدمت میں سلام کہیئے اور اُن کو اشعار دکھایئے۔
> میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ مس عطیہ آپ کو دکھائیں گی۔"

یا پھر ہمیں یہ شعر ملتا ہے جو اقبال نے کسی صحبت میں لفظِ "پرائیوٹ" کی احتیاط کے ساتھ عطیہ بیگم کو لکھ کر دیا تھا ۔

> عالم جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ!
> کہیئے کیا حکم ہے، دیوانہ بنوں یا نہ بنوں؟

اِن دونوں ہی تحریروں میں "سلام کہیئے" "اشعار دکھایئے" اور کہیئے کیا حکم ہے" کے فقرے صاف طور پر ضمیر "آپ" کے حق میں معلوم ہوتے ہیں، اِس لئے میں نے بھی اپنے ترجمے میں "تم" کے بجائے "آپ" ہی کو اختیار کیا ہے۔ اور یہی علمی دیانتداری کا تقاضا بھی تھا، چاہے اس سے بقولِ علامہ شبلی "بیگانہ پن" ہی کیوں نہ ظاہر ہوتا ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں "آپ" یا "تم" کے پھیر میں نہ پڑ کر دیکھنا یہ چاہیے کہ اقبال نے اِن مکاتیب میں لکھا کیا ہے۔ اِن مکاتیب کو پڑھنے کے بعد شاید آپ مجھ سے اِس معاملے میں اتفاق کریں کہ باتیں صرف وہی نہیں ہیں جو سطروں میں سیاہی سے لکھی گئی ہیں، بلکہ وہ بھی ہیں جو بین السطور میں خونِ جگر سے رقم ہوئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم انھیں پڑھ نہ سکیں، بہر طور بوئے گُل کی طرح محسوس کئے بغیر تو ہرگز نہیں رہ سکتے بشرطیکہ صاحبِ ذوق ہوں اور رہ و رسمِ محبت کے رمز آشنا!!

منظر عباس نقوی

علی گڑھ، ۱۳ مارچ ۱۹۷۳ء

Trinity College
Cambridge

24th April 07.

My dear Miss Fyzee,

I enclose herewith one of the poems I promised to send you, and shall feel obliged if you could read it carefully and let me know of your criticism.

I was thinking of sending you a copy of my Political Economy in Urdu, but I am sorry I have not got one here though it would not be difficult to get it from India. I shall write for it this mail.

Hoping you are getting on well

Yours very sincerely
S. M. Iqbal

خطوط

"شاعر کے لٹریری اور پرائیویٹ خطوط سے اُس کے
کلام پر روشنی پڑتی ہے اور اعلیٰ درجے کے شعرا
کے خطوط شائع کرنا لٹریری اعتبار سے مفید ہے۔"

(مکتوب اقبال بنام حاجی محمد احمد خاں)

انوارِ اقبال ص-۱۱

۱

یہ اُن متعدد خطوط میں سے ایک ہے جو علاّمہ اقبالؔ نے قیامِ انگلستان کے زمانے میں بیگم عطیہ فیضی کو لکھے تھے۔ یہ خطوط، جیسا کہ بیگم فیضی کا بیان ہے، بیش تر علمی مباحث اور فلسفیانہ مذاکرات پر مشتمل تھے۔ اُس وقت چونکہ اِن خطوط کی کوئی خاص اہمیت دکھائی نہیں دیتی تھی، اِس لیے محفوظ نہ رہ سکے اور وقت کے ساتھ ضائع ہو گئے۔

اِس خط کے ساتھ ہی ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے اقبالؔ کے اصل انگریزی خط اور اُس نظم کا عکس بھی پیش کیا جا رہا ہے جو اِس خط سے منسلک تھی۔

ٹرینٹی کالج

کیمبرج

۲۴، اپریل ۸ء

مائی ڈیر مس فیضی

میں نے آپ سے جن نظموں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا اُن میں سے ایک ہمرشتۂ ہٰذا منسلک ہے۔ میں بے حد ممنون ہوں گا اگر آپ براہِ کرم اس کو بہ نظرِ غائر ملاحظہ فرمائیں اور مجھے اپنی تنقید سے آگاہ کریں۔

میرا ارادہ تھا کہ اپنی اُردو تصنیف علم الاقتصاد کی ایک جلد آپ کی خدمت میں ارسال کروں، لیکن افسوس ہے کہ اُس کی کوئی کاپی میرے پاس یہاں موجود نہیں، البتہ اُس کو ہندوستان سے حاصل کرنا دشوار نہ ہوگا۔ میں آج ہی کی ڈاک سے اُس کے لئے لکھوں گا۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص

ایس۔ ایم۔ اقبال

۲

بیگم عطیہ فیضی ۱۹۰۸ء میں یورپ سے ہندوستان واپس آ گئی تھیں۔ ایک سال بعد اُنھیں اپنے بہنوئی اعلیٰحضرت نواب سیدی احمد خاں والی جنجیرہ اور اپنی ہمشیرہ رفیعہ سلطان نازلی بیگم صاحبہ کے ہمراہ پھر انگلستان جانے کا اتفاق ہوا۔ یورپ سے واپسی پر اُن کی والدۂ گرامی کا انتقال ہو گیا۔ اس سانحہ کی اطلاع، ظاہر ہے کہ، اقبالؔ کو بھی دی گئی جو اُس زمانے میں لاہور میں تھے۔

اسی زمانے میں بیگم فیضی نے اپنے بہن بہنوئی کی جانب سے اقبالؔ کو جنجیرہ آنے کی دعوت بھی دی تھی۔

اس خط میں اقبال نے اِنھیں امور کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لاہور
۱۲ جنوری ۶۰ء

مائی ڈیئر مسٹر خطیب،

نوازش نامہ کا بہت بہت شکریہ جس کو ابھی پا کر مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ میں اظہارِ تعزیت کے لئے خود بمبئی آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ۲۵ دسمبر کو، جبکہ میں کانفرنس کی ایک بحث میں حصہ لے رہا تھا، مجھے گھر سے ایک تار ملا جس سے معلوم ہوا کہ میرے بھائی صاحب سخت بیمار ہیں۔ اُسی شام کو مجھے سیالکوٹ بھاگنا پڑا۔ بقیہ تعطیلات میں میں اُن کی تیمارداری کرتا رہا۔ الحمدللہ کہ وہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے میری خاطر اُن کی جان بچالی۔ میں نے اُن کا بہت پیسا خرچ کیا ہے اور اب بھی کر رہا ہوں۔ اُن کا تلف ہو جانا ہر نقطۂ نظر سے بے حد ہولناک ہوتا۔

اعلیٰحضرت، بیگم صاحبہ اور خود آپ کی بے پایاں عنایت کہ آپ لوگوں نے مجھے جنجیرہ آنے کی دعوت دی۔ کوئی چیز بھی اس سے زیادہ مسرت بخش نیز ذہنی اور جسمانی اعتبار سے منفعت رساں نہیں ہو سکتی۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ میں نے حال ہی میں اپنا دھندا شروع کیا ہے جس کا تقاضا ہے کہ مستقل طور پر یہاں موجود رہوں۔ مجھے دوسروں کی خاطر آپ کے لطفِ صحبت کو قربان کرنا ہی پڑے گا، باوجودیکہ میرے دل میں آپ کے پاس آنے اور آپ کو اور آپ کی ہمشیرہ صاحبہ کو آپ کے حالیہ غم میں سہارا دینے کی شدید ——

تقریباً زیر نہ ہو سکنے والی ——— آرزو ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں تھوڑا بہت آپ کے کام آسکتا ہوں، لیکن چند در چند حالات کی بنا پر میں اپنے جذبات کو انتہائی بے دردی سے کچلنے پر مجبور ہو گیا ہوں، اور حالات کا یہ جبر میری جیسی طبیعت کے انسان کو اور بھی شدت سے اپنا احساس دلا رہا ہے۔

براہ کرم اس تھوڑی سی دنیاداری کے لئے مجھ سے اظہار بیزاری نہ کیجئے گا جو بلاشبہ اُس عالم میں جبکہ ہم خوابستانِ شعر میں ہوتے ہیں ایک حماقت معلوم ہوتی ہے۔ غرض مستقبلِ قریب میں میرے لئے جنجیرہ آنا ممکن نہیں رہا ہے۔ بہر طور ستمبر کی تعطیلات میں جبکہ چیف کورٹ بند ہو جاتا ہے میں آپ سے ملاقات کا منصوبہ بنا سکتا ہوں۔ اعلیحضرت، بیگم صاحبہ اور آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارنا بیک وقت ضیافتِ طبع بھی ہے اور موجبِ مسرت بھی۔ براہ کرم اُن کی خدمت میں میرا مودبانہ سلام عرض کیجیے اور اُن کو ایک دور افتادہ دوست کی نیک خواہشات کا یقین دلائیے جس کے حالات نے اگرچہ اُس کو آپ حضرات کی ملاقات کے فوری مواقع سے بڑی بے رحمی کے ساتھ محروم کر دیا ہے لیکن جو اُس کے تخیلات کو اُس سے نہیں چھین سکتے۔

آپ کا:
ایس۔ایم۔اقبال
بار ایٹ لا

پس نوشت

ایرانی مابعد الطبیعیات پر میری کتاب شائع ہو گئی ہے۔ جلد ہی ایک کاپی آپکی خدمت میں ارسال کر دوں گا۔ نظمیں (غزلیات) امید ہے کہ جلد ہی شائع ہوں گی۔ وہ چھپیں گی ہندوستان میں، جلد بندی ہو گی جرمنی میں اور انتساب ہوگا خواتینِ ہند کے نام۔

پرائیویٹ

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ !
کہیے کیا حکم ہے؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

محمد اقبال

بمبئی - ۱۰ ستمبر ۳۱ء

(عطیہ کے لیے ایک آٹوگراف)

۳

اقبال کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی جانب سے عہدہ
پروفیسری کی پیشکش ہوئی تھی، جس کو قبول کرنے سے
انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ جب عطیہ بیگم کو اس کا
حال معلوم ہوا تو انھیں بڑی تشویش ہوئی اور
انھوں نے اقبال سے انکار کا سبب دریافت کیا۔
عطیہ بیگم کی خواہش تھی کہ اقبال علی گڑھ کی پروفیسری
قبول کرلیں کیونکہ انھیں یقین تھا کہ اس قومی درسگاہ کو
اقبال جیسی عظیم شخصیت سے بڑا فیض پہنچ سکتا ہے۔
زیر نظر خط میں عطیہ بیگم کے اسی استفسار کا
جواب ہے۔

مائی ڈیر مس فیضی

لاہور۔
۹ اپریل ۱۹۳۰ء

نوازش نامے کے لیے تہِ دل سے شکریہ، جو مجھے آج ہی صبح وصول ہوا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میر محمد صاحب کون ہیں۔ غالباً آپ اُن سے واقف نہیں لیکن اُن کی بیوی کو ضرور جانتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اِس اَتے پتے سے آپ اُن کو پہچان لیں گی۔

ہاں، میں نے علی گڑھ کے شعبۂ فلسفہ کی پروفیسری سے انکار کر دیا اور چند روز پیشتر لاہور گورنمنٹ کالج کے شعبۂ تاریخ کی پروفیسری قبول کرنے سے بھی انکار کر چکا ہوں۔ میں کوئی ملازمت کرنا ہی نہیں چاہتا۔ میرا منشا تو یہ ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو اِس ملک سے بھاگ جاؤں۔ سبب آپ کو معلوم ہے۔ میرے اوپر اپنے بھائی صاحب کا ایک طرح کا اخلاقی قرضہ ہے جو مجھے روکے ہوئے ہے۔ میری زندگی انتہائی اذیت ناک ہے۔ یہ لوگ میری بیوی کو میرے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔ میں نے والد صاحب کو لکھ دیا ہے کہ اُنھیں میری شادی طے کرنے کا کوئی حق نہیں تھا، خصوصاً جبکہ میں نے پہلے ہی اِس قسم کے کسی بھی بندھن میں گرفتار ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اُس کی کفالت کے لیے آمادہ ہوں لیکن اِس بات کے لیے بالکل تیار نہیں کہ اُس کو ساتھ رکھ کر اپنی زندگی کو عذاب بنالوں۔ ایک انسان کی حیثیت سے مجھے بھی خوش رہنے کا حق حاصل ہے۔ اگر سماج یا قدرت مجھے یہ حق دینے سے انکار کرتی ہے تو میں دونوں کا

باغی ہوں۔ اب صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ یا تو میں ہمیشہ کے لئے اِس بدبخت ملک سے چلا جاؤں یا پھر شراب میں پناہ لوں جس سے خودکشی قدرے آسان ہو جاتی ہے۔ کتابوں کے یہ مُردہ اور بنجر اوراق کوئی مسرت نہیں بخش سکتے۔ میرے دل میں اتنی آگ بھری ہے جو اِن کتابوں اور اِن سماجی ضابطوں کو جلا کر راکھ کر سکتی ہے۔ آپ کہیں گی کہ اِن کو ایک رحمان و رحیم خدا نے خلق کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ٹھیک ہو۔ اِس زندگی کے حقائق بہر طور ایک دوسرے ہی نتیجے پر پہنچاتے ہیں۔ ذہنی طور پر تو کسی رحمان و رحیم خدا کے بجائے کسی حیّ و قیوم اور قادرِ مطلق شیطان پر ایمان لانا نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ براہِ کرم مجھے اِس یاوہ گوئی کے لئے معاف فرمائیے گا۔ میں ہمدردی کا طالب نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لوں۔ آپ کو میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ اِسی سبب سے میں نے اپنے جذبات کے اظہار کی جرأت کی ہے۔ یہ راز کی بات ہے۔ براہِ کرم کسی سے کہیے گا نہیں!

امید ہے کہ اب آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میں نے ملازمت سے کیوں انکار کیا۔
مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کے لئے ابھی تک کسی اُستانی کا بندوبست نہیں کر سکا۔ کل "انجمن" کے سکریٹری صاحب نے بتایا کہ کسی اُستانی کا فراہم ہونا ممکن نہیں۔ کل میں نے ایک عام جلسہ میں تقریر کی جس کا موضوع تھا "سماجی ارتقاء کے عنصر کی حیثیت سے مذہب کا مفہوم"۔ میں نے چند اشارے نوٹ کر لیے تھے۔ معلوم نہیں کہ میں نے جو کچھ کہا وہ کسی نے قلمبند بھی کیا یا نہیں۔ انجمن کا لیکچر انگریزی میں ہوگا ——— "اسلام ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے" ——— اگر یہ چھپا تو ایک کاپی آپ کو ارسال کروں گا۔ "آبزرور" کے ایڈیٹر صاحب سے کہہ دوں گا کہ "آبزرور" کی ایک کاپی آپ کو بھیج دیں۔
عبدالقادر چیف کورٹ میں پریکٹس کی غرض سے لاہور آ گئے ہیں۔

۱۔اقبال یہاں مایوس کن قنوطیت میں مبالغہ کی حد پر جا پہنچتے ہیں،جس سے شخصیت پرست،صوفیت پرست محبین کی مثالی شخصیت پرستی کو دھچکا پہنچتا ہے،جہاں تک شراب کی طرف اشارہ ہے وہاں ظاہر پرستوں نے انہیں شراب نوش قرار دیا ہے مگر معلوم ہوتا ہے ،یہاں شراب کو صرف کنایہ میں مایوسی میں خود کشی کے گناہ سے کم گناہ جان کر گلے لگانے کے خوف کی طرف اشارہ دیا ہے ،اس سے یہ قطعاً ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ انہوں نے کبھی ایسا کیا یا وہ اس ملعون مشروب کو نوش فرمایا کرتے تھے۔واللہ اعلم،مع

مجھے یہ جان کر افسوس ہے کہ آپ کو میری اس بات پر یقین نہیں کہ میں آپ سے اور نواب صاحب و بیگم صاحبہ سے، جو میرے حال پر اتنے مہربان ہیں، ملاقات کی غرض سے بمبئی آنے کا آرزو مند ہوں۔ میں یقینی طور پہ وہاں آنا چاہتا ہوں، البتہ یہ ممکن بھی ہوگا یا نہیں اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے لئے اِس سے بڑھ کر کوئی راحت نہیں!

دو تین ہفتے ہوئے کہ مجھے آپ کی دوست مس واڑناسٹ کا خط ملا تھا۔ مجھے یہ لڑکی پسند ہے۔ کتنی اچھی اور سچی لڑکی ہے! میں نے اُس کو اور مشفق و معمر خاتون پروفیسر[1] کو خطوط لکھ دئے ہیں۔

نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں تسلیم و نیاز عرض ہے۔ انھیں میری رفاقت کا یقین دلائیے، جو اگرچہ اُن کے کسی کام کی تو نہیں ——— لیکن ہے پُر خلوص اور دائمی۔

مخلص
اقبال

۴

اقبالؔ کے خط کے جواب میں مس فیضی نے اُن کی ذاتی محرومی پر دلی ہمدردی اور اُن کے ذہنی خلفشار پر گہری تشویش کا اظہار کیا تھا اور اُن دوستوں کی یاد دلائی تھی جن سے اقبالؔ بہت مانوس تھے مثلاً اقبالؔ کے رفیقِ خاص شیخ عبدالقادر، جواں سال اور حسین خاتون پروفیسر مس واتزناسٹ اور مشفق و معمّر خاتون پروفیسر ہیرن۔

اِن سب باتوں کا مقصد اقبال کا دھیان اُن اذیت ناک ذاتی مسائل کی طرف سے ہٹانا تھا جن کا اقبالؔ نے گزشتہ خط میں تذکرہ کیا تھا۔

مائی ڈیر مس عطیہ، ۱۷ اپریل ۱۹۰۹ء

لاہور

آپ کے تشفی بخش کلمات کا شکریہ۔ آپ کے خط سے مجھے یک گونہ تسکین حاصل ہوئی۔

آپ لکھتی ہیں کہ آپ مجھ سے بہت سے سوالات کرنا چاہتی ہیں ——— پھر تامل کیا ہے ——؟

آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کوئی بات راز نہیں رکھتا۔ میرا ایمان ہے کہ ایسا کرنا گناہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میرے خطوط قطعی تسلی بخش نہیں ہوتے، لیکن ایسا ہونا لازمی طور سے اُن وجوہ کی بنا پر ہے جن کا آپ نے اپنے گزشتہ خط میں تذکرہ کیا تھا۔ مجھے فراموشی کا الزام نہ دیجیے۔ میں کچھ بھی نہیں بھولا، لیکن اِس کی وضاحت ضرور چاہوں گا تاکہ پتا تو چلے کہ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں ——— رات میں نے جنت کی سیر کی۔ اتفاقاً میرا گزر دوزخ کے دروازوں کی طرف سے ہوا۔ مجھے وہ مقام بلا کا سرد معلوم ہوا۔ فرشتوں نے مجھے محوِ حیرت دیکھا تو بتایا کہ یہ مقام اپنی ماہیت کے اعتبار سے بالکل سرد ہے لیکن چونکہ ہر شخص جو یہاں آئے گا وہ اپنی آگ اپنے ساتھ ہی لائے گا اِس لئے یہ جگہ بے حد گرم ہو جائے گی۔

اس ملک میں جہاں کوئلے کی کانیں ویسے بھی کم ہیں، کوشش کر رہا ہوں کہ میں بھی جتنے انگارے اکٹھے کر سکتا ہوں اکٹھے کر لوں۔

◆ یہاں اقبال عطیہ پر یہ آشکار کرتے ہیں کہ وہ ان کے دل کے ایسے قریب ہیں کہ ان سے کچھ چھپانا ایمان خراب کرنے کے برابر ہے،معج

◆ یہاں اقبال دانتے سے متاثر معلوم ہوتے ہیں جو خود ابن عربی کا سرقہ باز تھا،انکی سیر اور ملاییکہ سے گپ شپ انکے تخیل اور خواب دیکھنے کی طرف اشارہ کرتی ہے،رومی کے صوفیانہ داخلی تخیل کو بھی خود پر حاوی کرتے محسوس ہوتے ہیں۔معج

عبدالقادر سے ملاقات اکثر و بیشتر ہوتی ہے، چیف کورٹ کے بار روم میں تقریباً روزانہ ہی —— لیکن عرصے سے آپ کے بارے میں ہمارے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی ہے۔ میں اب کسی سے زیادہ بات ہی نہیں کرتا۔ میرا اپنا منحوس وجود اذیت ناک انکار کی ایک کان ہے، جو میری روح کے عمیق اور تاریک شگافوں سے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے برآمد ہوتے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک سپیرہ بن جاؤں گا اور سڑکوں پر گھوما کروں گا، اس طرح کہ نرلیس بچّوں کا ایک ہجوم میرے پیچھے پیچھے ہوگا۔

یہ نہ خیال کیجیے کہ میں ایک قنوطی ہوں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مصیبت بے حد لذیذ شے ہے۔ میں اپنی بدنصیبی سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور اُن لوگوں پر ہنستا ہوں جو خود کو شاد کام تصوّر کرتے ہیں۔ دیکھیے میں کس خوبصورتی سے اپنے لئے مسرّت چُرا لیتا ہوں!

کچھ دن قبل مجھے مس ناز ناسٹ کا ایک خط ملا تھا۔ جب میں انھیں خط لکھوں گا تو انھیں اُن دنوں کی یاد دلاؤں گا جب آپ جرمنی میں تھیں —— ہاں، وہ دن جو پھر لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ وہ فی الحال اپنے وطن ہیل برون میں ہیں، لیکن یقین ہے کہ اب وہ خاتون پروفیسر کے تدریسی کام میں مدد دینے کے لئے ہائیڈل برگ پہنچ گئی ہوں گی۔ آپ اطمینان رکھیں کہ وہ بالکل بخیریت ہیں —— بدخطی کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ پہلے کیا لکھا تھا۔ ہر لمحہ اپنے ساتھ اپنا مخصوص خیال لاتا ہے۔ اس لئے اگر آپ کو میرے خط میں کوئی بے ربطی نظر آئے تو درگزر فرمائیں۔

جہاں تک اُستانی کا تعلق ہے، آج مجھے انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے مدرسۂ نسواں کی نگراں کے توسط سے ایک درخواست موصول ہوئی ہے۔ میں اُن خاتون سے خط و کتابت کروں گا اور جلد ہی آپ کو نتیجے سے آگاہ کروں گا۔ لیکن میں

یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ آیا اُنھیں ایک پبلک اسکول میں پڑھانا ہوگا، نیز یہ کہ جنجیرہ میں یا بمبئی میں؟

میرے بڑے بھائی صاحب کا بمبئی سے تقریباً سولہ میل کی دوری پر واقع کسی مقام کو تبادلہ ہوگیا ہے۔ وہ جلد ہی روانہ ہو جائیں گے۔

اس خط کے ہمراہ "آبزرور" کے دو شمارے روانہ ہیں۔ امید ہے کہ آپ کو دلچسپ معلوم ہوں گے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب۔
شکریہ!

مخلص
اقبال

۵

مس فیضی کی کوششیں بار آور ہوئیں اور دھیرے دھیرے اقبال اپنے ذہنی خلفشار اور قنوطیت پر قابو پانے میں بہت حد تک کامیاب ہو گئے، جس کا اندازہ اُن کے اِس خط کے لب و لہجے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

مس فیضی نے اُنھیں لکھا تھا کہ جنجیرہ آنے کیلئے اُنھیں اسٹیمر، کشتی، تانگہ اور ساحلی کشتی —— غرض کئی سواریوں کو استعمال کرنا ہوگا۔ انھوں نے اقبال کو کسی معاملے میں، جو خود عطیہ بیگم کی یادداشت میں بھی محفوظ نہیں رہا، محتاط رہنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔

اقبال کے اِس خط میں اِنھیں امور کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

مائی ڈیر مس عطیہ

لاہور

۱۷ جولائی ۹ء

ابھی ابھی آپ کا خط ملا جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آج میں خود کو غیر معمولی طور پر بشاش محسوس کر رہا ہوں۔ اس لیے اگر آپ کو میرے خط میں مزاح کی ایک لہر نظر آئے تو مجھے معاف فرمائیے گا۔ میرے منصوبوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے' آپ کا میری خاموشی سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں —— ہاں، اس میں شک نہیں کہ میں کبھی کبھی دو کشتیوں، ایک اسٹیمر، دو تانگوں اور دو چھوٹی ساحلی کشتیوں کے تصور سے خوفزدہ ہو جاتا ہوں —— ایک سچ مچ کا ہفت خواں، جس کو طے کر لوں تو مجھے بھی رستم جیسی شہرت نصیب ہو۔ رستم کا مقصد عظیم تھا، جبکہ مجھے یہ بھی پتا نہیں کہ میرا مقصد کیا ہے۔ میں بالعموم ایک کام کا تہیہ کرتا ہوں اور پھر خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا ہوں کہ جدھر چاہیں مجھے لے جائیں۔

آپ اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ آپ نے میرے ساتھ کیا حسن سلوک کیا ہے۔ یہ درست ہے اور بہتر ہی ہے۔ آپ اس سے آگاہ ہو بھی نہیں سکتیں۔ میں خوب آگاہ ہوں، یہ اور بات ہے کہ اس کے اظہار کی جرأت نہیں رکھتا —— چھوڑیئے بھی یہ موضوع —— میرے لئے ایک ناقابلِ بیان بات کو بیان کرنا سعیٔ لاحاصل کے مترادف ہوگا اور پھر آپ کا کہنا ہے کہ آپ کو قائل نہیں کیا جا سکتا۔

وہ حسین شکائتیں (جن کو چھوٹی موٹی کہنا نادرست ہوگا) کیا میں اُن کو معلوم کر سکتا ہوں؟ اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالئیے خصوصاً اُس حالت میں کہ یہ شکائتیں مجھ ہی سے ہوں۔

اِس میں کیا شک ہے کہ ہر شخص صبر و سکون کے ساتھ اپنی دائمی آرام گاہ کا منتظر ہے۔ میں بھی اُس جگہ جانے کا متمنی ہوں، کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے خالق کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اُس سے اپنی ذہنی کیفیت کی عقلی تعبیر و تشریح کا مطالبہ کروں جو، میرا خیال ہے کہ، اُس کے لئے کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔

میں خود اپنے لئے ناقابلِ فہم ہوں۔ آپ کی شکایات بے جا ہیں۔ برسوں پہلے میں نے کہا تھا ؎

اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اِس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

کتنے ہی لوگوں نے میرے بارے میں اسی طرح کی بات کہی ہے۔ میں اکثر خود بھی تنہائی میں خود پر ہنستا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ اب اِس طرح کی باتوں کا ایک قطعی جواب دے دوں، جس کو آپ "مخزن" میں چھپا ہوا دیکھیں گی۔ میں نے بڑی عمدگی سے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو لوگ میرے بارے میں سوچتے ہیں۔ جواب پھر بھی تصدیق طلب ہے۔

مجھے یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ اس بات سے بڑی دکھی ہیں کہ شمالی ہند کے لوگ میری قدر و منزلت نہیں کرتے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مجھے دوسروں کی قدر دانی کی مطلق پروا نہیں ہے۔ میں نفسِ غیر پر جینے کا قائل نہیں ؎

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

میں ایک بے لاگ اور کھری زندگی گزارتا ہوں۔ میرے دل اور زبان میں

پوری ہم آہنگی ہے۔ لوگ ریاکاری کی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ مجھے اگر ریاکاری سے شہرت، عزّت اور ستائش حاصل ہو بھی تو میں اُس کے مقابلے میں گمنامی کی موت کو ترجیح دوں گا۔ عوام النّاس اپنی ناکارہ قدر و منزلت دوسروں ہی پر نچھاور کریں جو اُن کے جھوٹے مذہبی اور اخلاقی معیاروں کے مطابق عمل کرتے اور زندگی گزارتے ہیں۔ میں اُن کے ایسے سماجی ضابطوں کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتا جو انسانی ذہن کی فطری آزادی کو پامال کر دیتے ہیں۔ بائرن[1]، گوئٹے[2] اور شیلی[3] کی بھی تو اُن کے معاصرین نے کوئی قدر نہیں کی۔ ہر چند کہ میں ملکۂ شعری کے اعتبار سے اُن سے بہت کمتر ہوں لیکن مجھے فخر ہے کہ اِس معاملے میں اُن کا جلیس و ہمدم ہوں۔

میں نے آپ کو پڑھایا ہے؟ آپ تو کبھی درس و تدریس کی محتاج نہیں رہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے آپ کو افلاطون سے متعارف کرایا تھا —— اور بس۔ ہمارا وہ مطالعہ اس قدر محدود تھا کہ میں ایمانداری کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے آپ کو پڑھانے کا شرف حاصل کیا۔

آپ کہتی ہیں کہ میں آپ کی نیک خواہشات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ یہ واقعی بڑی عجیب بات ہے کیونکہ میں تو ہمیشہ اِس بات کا بڑا خیال رکھتا ہوں کہ آپ کی آرزوؤں کی تعمیل کروں اور جس طرح بن پڑے آپ کو خوش رکھ سکوں، لیکن کبھی کبھی ایسا کرنا، بلاشبہ، میرے اختیار سے باہر ہوتا ہے، اس لیے کہ خود میری فطرت کا دباؤ مجھے کسی دوسری ہی سمت دھکیل کر لے جاتا ہے۔

"ورنہ آپ کچھ زیادہ ہی محتاط رہیں گے"۔ اِس سے آپ کی کیا مراد ہے؟ واقعی میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ براہِ کرم وضاحت کیجئے کہ میں کس معاملے میں زیادہ احتیاط سے کام لوں گا۔ میں وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں جس میں آپ کی خوشی ہو۔

البتہ دُنیا میری پرستش نہیں کرسکتی - میری پرستش نہیں ہوگی، کیونکہ میری فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں پرستش کا موضوع نہیں بن سکتا ——— میرے اندر ایک پرستار کی جبلت ہے ہی اتنی شدت سے جاری و ساری! البتہ اگر میری روح کے نہاں خانے میں پوشیدہ افکار عوام کے روبرو بے نقاب ہو جائیں اور میں وہ سب کچھ کہہ سکوں جو میرے دل میں مخفی ہے تو پھر یقیناً میرے مرنے کے بعد ایک نہ ایک دن دنیا میری پرستش کرے گی۔ لوگ میرے گناہوں کو بھول جائیں گے اور مجھے خراجِ عقیدت کے طور پر کم سے کم ایک قطرۂ اشک ضرور پیش کریں گے۔

لاہور گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کی جگہ کے لئے لیفٹنٹ گورنر صاحب سکریٹری حکومتِ ہند سے میری سفارش کرنے پر رضامند تھے، لیکن میں نے اپنے ذاتی رجحان کے برخلاف اِس جگہ کی امیدواری کا خیال ترک کر دیا ہے۔ حالات کا دباؤ مجبور کر رہا ہے کہ اِن معاملات پر مالی نقطۂ نظر سے غور کروں ——— ایک ایسا نقطۂ نظر جو چند سال پہلے تک میرے لئے بے حد مکروہ تھا۔ میں نے خدا کی مدد پر بھروسا کر کے پیشۂ وکالت جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

کیا آپ مجھے اُس نظم کی نقل بھیج سکیں گی جو میں نے آپ کو میونک سے بھیجی تھی؟ میرے پاس اُس کی کوئی کاپی نہیں۔ چاہتا ہوں کہ ایک میرے پاس بھی رہے۔

نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے۔

مخلص

محمدؐ اقبال

سنہ ۱۹۰۷ء	عطیہ اور اقبال	ہائیڈل برگ

۶

مارچ ۱۹۰۹ء میں اقبال حیدرآباد دکن گئے۔ وہاں اُن کا قیام سر اکبر حیدری کے یہاں رہا جو عطیہ بیگم کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ لاہور واپس پہنچنے پر انھیں اپنی دوست عطیہ بیگم کا خط ملا جس میں انھوں نے اِس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ غالباً اقبال ریاست حیدرآباد کی ظاہری شان و شوکت سے مرعوب ہو گئے ہیں اور جاہ و ثروت کے آرزومند ہیں۔ وہ یہ پسند نہیں کرتی تھیں کہ اقبالؔ جیسا آزاد خیال اور بلند فکر شاعر ایک دیسی ریاست کے حقیر خانگی جھگڑوں میں پڑ کر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو برباد کرے۔ اقبالؔ کی اِس ذہنی تبدیلی پر انھوں نے اظہارِ حیرت بھی کیا تھا اور دوستانہ ملامت بھی۔ اقبالؔ کا یہ خط اُسی "ملامت نامے" کا جواب ہے۔

مائی ڈیر مس عطیہ

لاہور
۳۰ مارچ ۱۰ء

آپ کے "ملامت نامے" کے لئے سراپا سپاس ہوں، جسے پڑھ کر بڑا لطف آیا۔ کوئی چیز بھی ایک دوست کی ملامت سے زیادہ پُر لطف نہیں ہو سکتی۔ حیدر آباد میں اعلیٰ حضرت کا دعوت نامہ ملا تھا۔ اس کے فوراً ہی بعد میں نے آپ کو لکھ دیا تھا میرا مُڑ کر آنا کیوں ممکن نہیں۔

کل اپنی واپسی پر مجھے آپ کا خط ملا ـــــ پیارا ملامت نامہ ـــــ میں نے اعلیٰ حضرت کو بذریعہ تار مطلع کر دیا ہے کہ میں کالج کی ملازمت[۲۴] کے باعث، جو بارہا میری راہ میں مزاحم ہوئی ہے، حاضر نہیں ہو سکا۔ اگر مزید کچھ دن حیدر آباد میں میرا قیام ممکن ہوتا تو یقین ہے کہ اعلیٰحضرت نظام مجھ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار ضرور فرماتے۔ وہاں کے جملہ عمائد سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ اُن میں سے اکثر نے مجھے اپنے دولت کدوں پر مدعو کیا۔ میرے دورۂ حیدر آباد کا ایک خاص مقصد تھا، جس کی وضاحت بروقتِ ملاقات ہوگی۔ میرے اس دورے کی غایت محض سر حیدری[۲۵] اور ان کی بیگم صاحبہ سے ملاقات نہیں تھی۔ غالباً یہ بات آپ بھی جانتی ہیں کہ حیدر آباد جانے سے بیشتر مجھے اُن سے کبھی شرفِ نیاز حاصل نہیں ہوا تھا۔ اُن کے پاس میرا قیام بے حد پُر لطف رہا۔ بیگم حیدری کی بے پایاں عنایت ہے کہ انھوں نے

میرا تذکرہ ایسے محبت آمیز الفاظ میں کیا۔ اُن کے دولت خانے پر مجھے کسی قسم کا تکلف محسوس نہیں ہوا۔ میں اُن کی غریب نوازی جیسی مہماں نوازی اور خلوص سے بیحد متاثر ہوں۔ اُن تمام معاملات میں جو اُن کی توجہ اور ہمدردی کے طالب ہوتے ہیں میں اُن کی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست کا قائل ہو گیا ہوں۔ بیگم اور سر حیدری کے ذاتی اثر و رسوخ ہی کی بدولت مجھے خوش قسمتی سے حیدرآبادی معاشرے کے بعض بہترین نمونے دیکھنے کا موقع ملا۔ سر حیدری اعلیٰ تہذیب اور وسیع دلچسپیوں کے مالک ہیں۔ میرا قیاس تھا کہ وہ خشک حقائق اور اعداد و شمار والے انسان ہوں گے، لیکن قدرت نے انھیں ایک اعلیٰ درجے کا تخیّل اور ایک بے حد حساس دل ودیعت فرمایا ہے۔ میرے دل میں اُن دونوں کے لئے بڑا احترام ہے۔ میں نے اب تک جو گھر دیکھے ہیں اُن میں اُن کا گھر دوسرا حقیقی گھر ہے، پہلا آرنلڈ اور مسز آرنلڈ کا تھا —— بیگم حیدری ایسے وجدان کی مالک ہیں جس کی مدد سے وہ اشیاء کا ادراک کہیں زیادہ واضح صورت میں کر سکتی ہیں بمقابلے ہم مردوں کے جو اس معاملے میں صرف اپنی بے روح تجزیاتی عقل ہی پر بھروسا کرتے ہیں۔

اب آپ سے گزارش ہے کہ براہِ کرم اعلیٰحضرت اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں میری معذرت پہنچا دیں اور میری جانب سے معافی چاہ لیں۔ مجھے واقعی کچھ پتا نہیں کہ اُس خط کا کیا ہوا جو میں نے آپ کو اعلیٰ حضرت کا تار وصول ہونے کے بعد لکھا تھا
بدقسمتی سے میں ایک ایسا شخص واقع ہوا ہوں جسے اظہارِ محبت کا سلیقہ نہیں آتا، لیکن اِس عدمِ اظہار کا یہ مطلب نہیں کہ میری محبت کسی طرح بھی سطحی ہے۔ لوگوں کو مجھ پر سرد مہری کا گمان ہونے لگتا ہے براہِ کرم اعلیٰحضرت اور بیگم صاحبہ کو یقین دلائیے کہ میں اُن کا تابعِ فرمان ہوں اور یہ کہ جب بھی ممکن ہوا بسر و چشم حاضر ہوں گا۔

میرے پاس صرف دس روز کی اتفاقیہ رخصت تھی جو ۲۸ کو ختم ہو گئی میں ۲۲ کو

حیدرآباد سے چل دیا کیونکہ حیدرآباد سے لاہور پہنچنے میں تقریباً چار روز لگ جاتے ہیں۔ مزید برآں واپسی میں مجھے اورنگ زیب عالمگیرؒ کے مزار کی زیارت بھی کرنی تھی جن پر میں ایک ایسی ولولہ انگیز نظم لکھنے والا ہوں جو اُردو کے قاریوں نے اِس سے پہلے کبھی نہیں پڑھی ہوگی۔

میں ۲۹ کی صبح کو لاہور پہنچا۔ اُترتے ہی سیدھے کالج جانا پڑا اور وہاں سے کچہری۔ اِن حالات میں آپ خود سوچ سکتی ہیں کہ میرے لئے جنجیرہ کا دورہ کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اعلیٰ حضرت اور بیگم صاحبہ کے لطفِ ملاقات سے دستبردار ہونا پڑا۔ امید ہے کہ یہ وضاحت آپ کو اپنی بات باور کرانے کے لئے کافی ہوگی اور آپ میری جانب سے اُن کی خدمت میں فریضۂ وکالت انجام دینگی۔

مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں، لیکن ریاکاری اور بے اعتنائی ہرگز نہیں —— ہوسکتا ہے کہ میں ایک راز ہوں (خود کے لئے بھی!) جیسا کہ غالباً آپ کہنا چاہیں گی۔ لیکن یہ راز ہر شخص پر آشکار ہے —— ع

"وہ راز ہوں کہ زمانے پہ آشکار ہوں میں"

ہوسکتا ہے کہ میرے طور طریق عجیب ہوں، —— لیکن اس خبیث دُنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جن کے طور طریق میرے طور طریق سے بھی عجیب تر ہیں۔ انسان کی حقیقی فطرت کا امتحان وقت آنے پر ہی ہوتا ہے۔ وقت آنے پر میں آپ کو دکھادوں گا کہ میں اپنے دوستوں سے کیسی شدید محبت کرتا ہوں اور میرے دل میں اُن کے لئے کیا جذبات ہیں۔ لوگ زندگی کو بے حد عزیز رکھتے ہیں —— اور ٹھیک بھی ہے یہ —— بہر طور مجھ میں وہ قوت موجود ہے کہ اگر دوسروں کو ضرورت پڑے تو بے دھڑک اپنی جان قربان کر سکتا ہوں۔

نہیں، مجھے بے اعتنا یا ریاکار نہ کہیئے، اشاروں اور کنایوں سے بھی نہیں۔

کیونکہ اِس سے میری روح کو صدمہ پہنچتا ہے اور اپنی فطرت سے آپ کی اِس
ناواقفیت کا تصور کر کے میں کانپ اٹھتا ہوں۔ کاش، میں اپنا دل کھول کر
آپ کو دکھا سکتا جس کے بارے میں آپ کا خیال ہے کہ اُس میں ریاکاری
اور بے اعتنائی کی ظلمتوں کے سوا کچھ نہیں۔ اِس ناگزیر کوتاہی کے لئے میری
جانب سے اعلیٰ حضرت اور بیگم صاحبہ سے معافی چاہ لیجئے اور مجھے اس
امر سے آگاہ کیجئے کہ میرا عذر قبول ہوا یا نہیں۔

آپ کا
محمد اقبال

My ways may be strange, but there are people in this wicked world whose ways are stranger than mine. Opportunity is the only test of a man's real nature. If any opportunity comes I shall certainly show you how intensely I love my friends and how deeply my heart feels for them all. People hold life dear and rightly so: I have got the strength to give it freely away when it is required by others. So! don't call me indifferent or hypocrite — not even by implication, for it hurts my soul and makes me shudder at your ignorance of my nature. I wish I could turn inside outward in order to give you a better view of my soul which you think is darkened by hypocrisy and indifference.

Please ask forgiveness on my behalf for this unavoidable remissness and let me know immediately that my explanation has convinced him.

Yours ever
Mohd. Iqbal

۷

معلوم ہوتا ہے کہ عطیہ بیگم نے اِسی قسم کا ایک اور ملامت نامہ اقبال کو لکھا۔ انھیں یہ بات انتہائی ناپسند تھی کہ اقبال اپنی غیر معمولی ذہانت اور فکرِ رسا کو کسی ہندوستانی ریاست کی چپقلش میں پڑ کر برباد کردیں۔ اُنھیں اقبال سے اس بات کی بھی بڑی شکایت تھی کہ وہ حیدر آباد سے واپسی میں جنجیرہ نہیں آئے۔

اس خط میں اقبال نے اِنھیں باتوں کا جواب دیا ہے اور اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اپنی عزیز دوست عطیہ بیگم کو منانے کی کوشش کی ہے۔

مائی ڈیر مس عطیہ!

لاہور

،اپریل سنہء

آپ کے نوازش نامے کا جو مجھے آج ہی صبح ملا بہت بہت شکریہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہ بات نہیں سمجھ پائیں کہ میں نے حیدرآباد سے آپ کو دو خط لکھے تھے۔ ایک تو آپ کا کوئی خط ملنے سے پیشتر ہی اور دوسرا آپ کا تار ملنے کے بعد۔ اپنے دوسرے خط میں میں نے آپ کے تار کی رسید دی تھی اور اس امر کی وضاحت کی تھی کہ میرے لئے جنجیرہ آنا کیوں ممکن نہیں۔ بدقسمتی سے یہ دوسرا خط کہیں گم ہو گیا ورنہ اس طعن و تشنیع کی نوبت نہ آتی۔ حیران ہوں کہ وہ آپ تک کیوں نہیں پہنچا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ میرے طرزِ عمل اور محرکات کے بارے میں بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں، اور اس کا ازالہ آپ سے ملے بغیر ممکن نہیں۔ یہ بات، اُس دوستی کی خاطر جس کا میں تا حال دعویدار ہوں، از بس ضروری ہو گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ملیں، اور مجھے اس کے لئے وقت نکالنا ہی ہوگا، اگرچہ آپ کا خیال ہے کہ اب مجھے زبانی صفائی کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ کو اپنی صداقت اور خلوص کا یقین دلا سکوں گا کیونکہ مجھے آپ کی نیک نفسی پر کامل اعتماد ہے۔ بہر طور فی الحال میں آپ سے گزارش کروں گا کہ اعلیٰ حضرت اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں میری صفائی پیش کر دیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ اُن میں درگزر کا مادّہ آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے درمیان جو غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اُس کے بہت سے اسباب ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ یہ اسباب غیر شعوری

طور پر آپ کے ذہن میں کام کر رہے ہیں۔ یہ میری انتہائی بدنصیبی ہے کہ ان اسباب نے آپ کو مجھ سے اس حد تک بدظن کر دیا ہے کہ آپ مجھ کو سخن طرازی اور کذب بیانی کا الزام دیتی ہیں۔ براہِ کرم میرے دورۂ حیدرآباد سے ایسا کوئی نتیجہ نہ نکالیے ـــــ مثلاً نظام کی قدردانی وغیرہ ـــــ جب تک آپ میری پوری بات نہ سُن لیں۔ ایسے وقت میں جبکہ میں اس کا مشکل ہی سے متحمل ہو سکتا تھا میں نے اتنا طویل سفر محض احباب سے ملاقات کی غرض سے ہرگز نہ کیا ہوتا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ حیدرآبادی معاشرے کے بارے میں جو کچھ آپ کا خیال ہے میں اُس سے قطعی متفق ہوں۔ آج صبح تک جبتک آپ کا خط مجھے نہیں ملا تھا میرا بھی خیال تھا کہ آپ کے اُس خط میں جو مجھے لاہور واپس پہنچنے پر ملا تھا خوشنودیٔ خاطر کی ایک زیریں لہر پائی جاتی ہے۔ لیکن اس خط نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ حقیقتاً مجھ سے خفا ہیں۔ آپ کے خط نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے اور مجھے یہ کیفیت اُس وقت تک برداشت کرنی پڑیگی جبتک میں آپ کے سامنے اپنی صفائی نہ پیش کردوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری ذہنی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ میں اب بھی وہی شخص ہوں، اور ایک دن آپ خود اس کی قائل ہو جائیں گی ـــــ یہ میری پیش گوئی ہے۔

میں نے نظام کی قدردانی کو کب بڑا اعزاز قرار دیا؟ آپ جانتی ہیں کہ میں ان سب چیزوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ مجھے تو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہونے کی کوئی آرزو ہے ہی نہیں، یہ اور بات ہے کہ لوگ بدقسمتی سے مجھے اسی حیثیت سے جانتے ہیں۔ کل ہی میرے پاس نیپلز (Naples) کی ایک معزز اطالوی خاتون کا خط آیا ہے جس نے میری چند نظمیں معہ انگریزی ترجمے کے مانگی ہیں۔ لیکن میرے دل میں شاعری کے لیے کوئی ولولہ نہیں رہا، اور اس کی ذمہ دار آپ ہیں! مجھے ایک دیسی نواب کی

قدر دانی کی کیا پروا جبکہ مجھے بیرونی ممالک کے متمدن حضرات کی قدر دانی حاصل ہے ؟ —— نہیں، عزیزی مس خطیبہ! مجھے غلط نہ سمجھیے اور اُس بے رحمی سے کام نہ لیجیے جس کا مظاہرہ آپ نے اپنے گزشتہ خط میں میری توقعات سے بڑھ کر کیا ہے۔ آپ نے پوری بات سنی ہی نہیں۔ آپ کو میری اُن مشکلات کا کوئی علم ہی نہیں جو بڑی حد تک میرے طرزِ عمل کی وضاحت کر دینگی۔ آپ کی طرف میرا کیا رویّہ ہے، اِس کی مکمل وضاحت کے لیے ایک ناقابلِ برداشت حد تک طویل خط درکار ہوگا —— غالباً ایک سے زیادہ خطوط۔ مزید برآں کاغذ پر بنی آواز کی محض تحریری علامتوں کے مقابلے میں خود الفاظ کی حقیقی آواز ہی کسی بات کو زیادہ بہتر طریقے پر باور کرا سکتی ہے۔ کاغذ انسانی احساس سے عاری ہوتا ہے اور کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اظہار کاغذ پر نہیں ہونا چاہیئے۔ میرے محرکات کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیجیئے۔ آپ مجھے بندۂ زر اور دنیادار بن جانے کا الزام دیتی ہیں۔ اِس میں صداقت کا ایک عنصر ضرور ہے، لیکن جب آپ کو تمام حالات کا علم ہوگا تو خود ہی میرے طرزِ عمل کا جواز بھی مل جائے گا۔ دیگر اعتبارات سے میں اب بھی ایک تخیّلی آدمی ہوں اور "ایک پُرتجسس تخیّل رکھنے والا خواب پرست"، جیساکہ حال ہی میں میرے متعلق آپ کے ایک دوست نے اُردو ادب کے موضوع پر اپنے ایک مقالے میں کہا ہے۔

اعلیحضرت میرے ٹھور ٹھکانے کے بارے میں آپ کو سندِ مطلق سمجھتے ہیں تو اس میں غلط کیا ہے۔ یاد دلاؤں کہ آپ نے خود ہی اپنی اِس حیثیت کو برقرار رکھنا مناسب نہیں سمجھا، حالانکہ میں آپ کے اِس اختیار کا مُقر ہوں اور ہمیشہ مُقر رہوں گا۔ کچھ لوگ آپ کے بارے میں مجھے بھی اسی طرح سندِ مطلق تصوّر کرتے ہیں، لیکن میری محرومی دیکھیے کہ مجھے دوسرے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کا لاہور آنے کا

ارادہ تھا اور یہاں تشریف لائیں بھی! ـــــ اور آپ نے اتنی بھی زحمت گوارا نہ کی کہ مجھے ایک سطر ہی لکھ بھیجتیں۔ یہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ آپ سے ملاقات ہوگئی ـــــ وہ بھی اِس لئے کہ میری اذیّت میں اور اضافہ ہو جائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں وہ باتیں لکھ رہا ہوں جو گفتگو ہی تک محدود رہنی چاہئیں۔ میں اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں لکھوں گا کیونکہ جی چاہ رہا ہے کہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لوں اور بہت سی دوسری باتیں بھی کہہ ڈالوں ـــــ ضروری نہیں کہ وہ بھی اسی قسم کی ہوں ـــــ بہرطور جن کو تحریر میں لانا بے سود ہے۔ آپ کو اُن ہی دنوں کا واسطہ، جبکہ آپ کو مجھ پر بڑا اعتماد اور میرا بڑا خیال تھا، ـــــ میری ایک گزارش قبول کیجیے اور وہ یہ کہ میری جانب سے نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں عرض کیجیے کہ میری صورتِ حال کا احساس فرماتے ہوئے میری کوتاہی سے درگزر فرمائیں۔ میں آ سکتا تو میرے لئے اِس سے زیادہ خوشگوار کوئی بات نہ ہوتی۔ میں زیادہ کچھ نہیں کہتا، مبادا میرے خط کے لب و لہجے پر سخن طرازی کا گمان ہونے لگے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ آپ نے اپنی جانب میرے روّیے کے بارے میں جو غلط تاثر قائم کر لیا ہے، آپ میرے خطوط کو اُسی کے پس منظر میں پڑھتی ہیں، اور آپ کے دماغ نے فکر یا جذبے کی جس رَو میں بہنا شروع کر دیا ہے آپ اُس سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ اگر آپ ایسا کرنے سے قاصر ہیں تو پھر آپ کو صداقت اور دیانتداری کا واسطہ ـــــ جس سے اب میں تو، آپ کے خیال کے مطابق، محروم ہوں لیکن میں بہرطور جس کو پورے وثوق کے ساتھ آپ کا حصّہ خیال کرتا ہوں ـــــ اُس وقت تک توقّف کیجیے جب تک پوری بات آپ کے سامنے نہ آ جائے۔ یہی بات منصفانہ ہوگی؛ اور آپ بہرحال منصف مزاج ہیں ہر چند کہ کبھی کبھی سنگدل اور بے رحم بن جاتی ہیں ـــــ تو پھر اُنھیں دنوں کی یاد میں جو اگرچہ عالمِ طبیعی میں فنا ہو چکے، لیکن میرے دل میں ہمیشہ زندہ رہیں گے ـــــ میرا یہ پیغام اُن تک ضرور پہنچا دیجیے کہ میری کوتاہی کو

بے اعتنائی سے منسوب نہ فرمائیں یا یہ وسوسہ خاطرِ مبارک میں نہ لائیں کہ کسی دوسری ذات نے میرے دل میں گرم تر یا میری نظر میں بلند تر مقام حاصل کر لیا ہے۔

لاہور واپس پہنچنے پر مجھے آپ کا خط ملا تھا اور میں نے اعلیٰحضرت کی خدمت میں بذریعہ تار اِس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ میں کالج کی ملازمت کے باعث جنجیرہ حاضر نہیں ہو سکا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرا تار انھیں ملا یا میرے اُس خط ہی کی طرح کہیں گم ہو گیا جو میں نے حیدر آباد سے لکھا تھا اور جس کے نہ پہنچنے کی وجہ سے یہ افسوسناک غلط فہمی پیدا ہوئی۔

آپ نے بکمالِ عنایت نظم کی جو نقل ارسال فرمائی ہے اُس کے لئے تہِ دل سے مشکور ہوں۔ مجھے اِس کی سخت ضرورت تھی۔ بہت چاہا کہ اشعار یاد آ جائیں، لیکن بار بار کی کوشش کے باوجود بھی ناکام رہا۔ مجھے ملک کے مختلف حصّوں سے خطوط مل رہے ہیں جن میں مجھ سے اپنی نظموں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ایک صاحب نے، جن سے غالباً آپ مل چکی ہیں، مجھے اِس سلسلے میں سارا کام کرنے کی پیشکش کی ہے —— یعنی مقدمہ لکھنا، ہندوستان کے بہترین مطبع میں چھپوانا اور کتاب کی جرمنی میں جلد بندی کرانا۔ لیکن میرے دل میں شاعری کے لیے کوئی ولولہ نہیں رہا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے میری موزونیٔ طبع کو ہلاک کر دیا ہے اور میں اپنے تخیّل سے محروم ہو گیا ہوں۔ غالباً وہ نظم جو میں اورنگ زیب عالمگیرؒ پر لکھنے والا ہوں —— جس کے مقبرے کی حال ہی میں زیارت کی ہے —— میری آخری نظم ہو گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نظم لکھنا میرا فریضہ ہے۔ امید ہے کہ یہ مکمل ہو گئی تو بہت دن تک یاد رکھی جائے گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب مجھے خط تمام کرنا چاہئے —— کافی سمع خراشی

گزر چکا۔ اب رات کے ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ دن بھر کے کام کے بعد میں بُری طرح تھک چکا ہوں اور ایک بوجھل دل کے ساتھ سونے جا رہا ہوں۔

آپ کے تمام طعن و تشنیع کا شکریہ ادا کرتے ہوئے

ہر حال میں آپ کا مخلص

محمد اقبال

لاہور

۷ اپریل ۱۰ء

علّامہ اقبال ۱۹۰۷ء میں

۸

اپریل ۱۰ء اور جولائی ۱۱ء کے عرصے میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جنھوں نے اقبالؔ کو سنجیدہ سے سنجیدہ تر بنادیا اور وہ زندگی اور کائنات کے عمیق مسائل پر طبع آزمائی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اِس طرح اُنھیں اپنی ذاتی محرومیوں کو بھُلانے میں بڑی مدد ملی۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے والدِ بزرگوار کی فرمائش پر ایک فارسی مثنوی بھی بوعلی شاہ قلندرؒ کے رنگ میں لکھنی شروع کی۔

زیرِ نظر خط میں اِنھیں امور کی جانب اشارے ملتے ہیں۔

مائی ڈیر مس فیضی

لاہور
۷ جولائی ۱۹۱۱ء

مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کے نوازش نامے کا، جو مجھے کچھ دن پہلے وصول ہوا تھا، ابھی تک جواب نہیں دے سکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس عرصے میں میں بہت زیادہ پریشان رہا۔ میری بدنصیبی ایک وفادار کُتّے کی طرح میرے پیچھے لگی ہوئی ہے اور میں ملکہ (Dame) کو اُس انتھک وفاداری کی بنا پر جو اُسے اپنے آفت رسیدہ بادشاہ سے ہے پسند کرنے لگا ہوں۔ اس کی تفصیل سے آپ کو بعد میں مطلع کروں گا۔

جہاں تک نظموں کا تعلق ہے آپ کو اُن کی ایک نقل ضرور ارسال کروں گا۔ میرے ایک دوست نے میری نظموں کا اپنا ذاتی مجموعہ بھیج دیا ہے۔ میں نے اِن کے ترجمے کے لئے ایک آدمی رکھ لیا ہے۔ اُس کا کام مکمل ہو جانے پر تمام نظموں پر نظرِ ثانی کروں گا؛ جو نظمیں قابلِ اشاعت پاؤں گا انھیں پھر لکھونگا اور ایک نقل آپ کو بھیج دوں گا۔ آپ کو میرے شکریے کی ضرورت نہیں کیونکہ جیسا کہ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے آپ کو منا لینا ہی میرا سب سے بڑا انعام ہے۔ اِس کے برعکس میں آپ کی اُس ستائش کے لئے ممنون ہوں جس کا میں قطعی مستحق نہیں۔ لیکن آخر آپ اِن نظموں کا کریں گی کیا ۔۔۔؟ ۔۔۔ یہ ایک مجروح دل کے نالے !

ان میں مسرت و انبساط کا تو کوئی شائبہ بھی نہیں، جیسا کہ میں نے اپنے انتساب میں کہا ہے سہ

خندہ ہے بہرِ طلسمِ غنچۂ تمہید شکست
تو تبسم سے مری کلیوں کو نا محرم سمجھ
درد کے پانی سے ہے سرسبزئ کشتِ سخن
فطرتِ شاعر کے آئینے میں جوہر غم سمجھ

اشاعت کے لئے انتخاب کرنا میری سب سے بڑی دقت ہے۔ گزشتہ ۵-۶ سال کے عرصے میں میری نظمیں نجی نوعیت کی زیادہ رہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ پبلک کو انھیں پڑھنے کا کوئی حق نہیں۔ اِن میں سے بعض کو تو میں نے بالکل ہی ضایع کر دیا ہے اِس خوف سے کہ کہیں کوئی جُرا کر شائع نہ کر دے۔ بہر طور دیکھوں کیا کیا جائے۔ والد صاحب نے حکم دیا ہے کہ ایک فارسی مثنوی حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کے رنگ میں لکھوں اور باوجود اِس کام کی دشواری کے میں نے اُن کے ارشاد کی تعمیل شروع کر دی ہے۔ ابتدائی اشعار یہ ہیں سہ

نالہ را اندازِ نو ایجاد کُن	بزم را از ہائے و ہو آباد کُن
آتش استی بزمِ عالم بر فروز	دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز
سینہ را سر منزلِ صد نالہ ساز	اشکِ خونیں را جگر پر کالہ ساز
پشت پا بر شورشِ دنیا بزن	موجۂ بیرونِ ایں دریا بزن

باقی اشعار ذہن میں محفوظ نہیں رہے لیکن امید ہے کہ کچہری سے واپسی پر یاد آجائیں گے۔ اب ۱۰ بج رہے ہیں اور مجھے چل دینا چاہئے۔ ایک غزل

◆ والد صاحب کی خواہش سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے انکے اثر میں رنگ کر شروع شروع میں متصوفانہ کلام و مجموعہ جات کی روح اخذ کرکے اوردو میں پیش کردی تھی جیسے رومی ،جامی ،ابن عربی، گوئٹے ،دانتے اور بو علی وغیرہ۔معج

ہمرشتہ ہذا منسلک ہے جو حال ہی میں "ادیب" میں شایع ہوئی ہے۔ میں نے اپنے دوست سردار امراؤ سنگھ کو (جن سے میرا خیال ہے کہ آپ واقف ہونگی) لکھا ہے کہ اُن چند اشعار کے اپنے انگریزی ترجمے کی ایک نقل مجھے بھیج دیں جو میں نے مس گاشمن (شہزادی دلیپ سنگھ کی ایک سہیلی) کو شالیمار باغ سے توڑے ہوئے ایک خوبصورت پھول کا تحفہ عطا کرنے پر لکھ کر دئے تھے۔[۲۸] مجھے اندیشہ ہے کہ اُن کی اصل میرے پاس نہیں رہی۔ میں آپ کے لئے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔

براہِ کرم اعلیٰحضرت اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں میرا سلام کہیئے۔ شکریہ!

مخلص

محمدؐ اقبال

۹

اقبالؔ اپنی تمام نئی نظمیں عطیہ بیگم کو بھیجتے رہتے تھے، ایسی نظمیں بھی جو کہیں شائع نہیں ہوئی تھیں۔ اِس خط کے ساتھ بھی انھوں نے اپنی کئی نظمیں عطیہ بیگم کو بھیجی تھیں، جو ضمیمے میں شامل کی جا رہی ہیں۔ اِن میں وہ نظم بھی ہے جس کو اقبالؔ نے بے حد مترنم بتایا ہے اور خواہش کی ہے کہ کاش وہ یہ نظم عطیہ بیگم اور اُن کی ہمشیرہ نازلی بیگم صاحبہ کو خود ترنم سے سُنا سکتے۔

ڈیر مس فیضی،

لاہور

۱۴ دسمبر ۱۹۱۱ء

آپ کا نوازش نامہ ابھی ابھی ملا ہے جس کے لئے سپاس گزار ہوں۔ اگر آپ سمجھتی ہیں کہ مسز نیڈو اُردو شاعری کو نہیں سراہ سکتیں تو اُن کو یہ نظم نہ دکھائیے۔

یہ اُن تازہ نظموں میں سے ایک ہے جو ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوئیں۔ کچھ دوسرے اشعار بھی پیشِ خدمت ہیں، جو پرسوں صبح سویرے چار بجے لکھے تھے۔ میں نے اِس بحر میں اس سے پہلے کبھی طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ یہ بے حد مترنم بحر ہے۔ کاش کہ میں وہاں موجود ہوتا اور آپ کو اور بیگم صاحبہ کو خود یہ نظم ترنم سے سناتا۔

مخلص

محمد اقبال

[illegible]

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش - جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش

بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار - جس کے ہر تار میں ہیں سینکڑوں نغموں کے مزار

محشرستانِ نوا کا ہے امیں جس کا سکوت - اور منت کشِ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت

آہ! امیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی

چوٹ اس ساز نے مضراب کی کھائی نہ کبھی!

گر آتی ہے نسیمِ چمنِ طور کبھی - سمتِ گردوں سے ہوائے نفسِ حور کبھی

چھیڑ آہستہ سے دیتی ہے مرا تارِ حیات - جس سے ہوتی ہے رہا روحِ گرفتارِ حیات

نغمۂ یاس کی دھیمی سی صدا اٹھتی ہے - اشک کے قافلے کو بانگِ درا اٹھتی ہے

جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے

میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے!

تشریحات

خطوط کے متن میں پائے جانے والے اُن الفاظ

کی تشریح جن پر نمبر پڑے ہوئے ہیں۔

(۱) یہ نظم بخطِ اقبالؔ ضمیمہ میں صفحہ .. پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۲) اقتصادیات کے موضوع پر اقبالؔ کی سب سے پہلی تصنیف جو بزبانِ اُردو "علم الاقتصاد" کے نام سے سنہ ۱۹۰۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔

(۳) اقبالؔ کے بھائی شیخ عطا محمدؒ جو اقبالؔ سے اٹھارہ سال بڑے تھے۔ رڑکی انجینئرنگ اسکول میں تعلیم پائی۔ ایم۔ ای۔ ایس میں اوورسیر تھے۔ کافی روپیہ کمایا۔ اقبالؔ کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور انگلستان بھیجا۔ اقبالؔ بھی بڑے بھائی پر جان چھڑکتے تھے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں بعمرِ بیاسی سال انتقال ہوا۔

(۴) عطیہ بیگم کے بہنوئی نواب سیدی احمد خاں صاحب والئی جنجیرہ اور اُن کی بیگم یعنی عطیہ کی بڑی بہن رفیعہ سلطان نازلی بیگم صاحبہ۔ عطیہ بیگم کی طرح یہ دونوں میاں بیوی بھی اقبالؔ کے بڑے مدّاح اور معترف تھے۔

۵ نواحِ بمبئی میں ایک خوبصورت سا جزیرہ جو ایک دیسی ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ عطیہ کے بہنوئی جن کا اوپر تذکرہ ہوا یہیں کے فرماں روا تھے۔

۶ مراد: لاہور چیف کورٹ میں وکالت جس کا آغاز ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء سے ہوا۔

۷ ڈاکٹریٹ کی سند کے لئے اقبال کا تحقیقی مقالہ جو
(Development of Metaphysics in Persia) کے
عنوان سے ۱۹۰۸ء میں لندن سے شائع ہوا۔

۸ علامہ اقبال کی پہلی بیوی جو گجرات کے ایک دولتمند بزرگ خان بہادر ڈاکٹر عطا محمدؐ خاں کی صاحبزادی تھیں۔ یہ شادی زمانۂ طالب علمی میں دستور کے مطابق محض والدین اور بزرگوں کی مرضی سے ہوئی، چنانچہ بُری طرح ناکام رہی۔ اقبال بیوی سے سخت ناخوش رہے یہاں تک کہ آخرکار عقدِ ثانی کر لیا۔

۹ شیخ نور محمدؒ جن کا بعمر نوّے سال ۱۹۲۹ء میں انتقال ہوا۔

۱۰ عطیہ بیگم جنجیرہ میں لڑکیوں کے لئے ایک اسکول کھولنا چاہتی تھیں جس کے لئے انھیں ایک اُستانی کی تلاش تھی۔

۱۱ مراد "انجمنِ حمایتِ اسلام" لاہور۔

۱۲ اقبالؔ کے دوست شیخ عبدالقادر، بار ایٹ لا، مُدیرِ مخزن، لاہور۔

۱۳ (Miss Wegenast) —— ہائیڈل برگ، جرمنی، کے زمانۂ قیام میں اقبالؔ کی جواں سال خاتون پروفیسر جو جرمن، یونانی اور فرانسیسی زبان اور فلسفے کی عالم تھیں۔ اقبالؔ اُن کی پرکشش شخصیت اور تبحّرِ علمی سے بہت متاثر تھے۔

۱۴ (Frau Prof. Herren) —— ہائیڈل برگ یونی ورسٹی کی محترم اور مُعمّر خاتون پروفیسر جو یونی ورسٹی ہاسٹل کی نگراں بھی تھیں اور فنِ موسیقی میں بڑی مہارت رکھتی تھیں۔

۱۵ اسی خیال کو اقبالؔ نے اپنے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے:
اہلِ دُنیا یہاں جو آتے ہیں ٭ اپنے انگارے ساتھ لاتے ہیں

۱۶ (Heilbronn) —— جرمنی کا مشہور شہر جو مس واگناسٹ کا وطن تھا۔

۱۷ (Fraulein Seneschal) —— جرمنی میں اقبالؔ کی ایک

دوسری نو عمر خاتون پروفیسر سینی شال جن کے تدریسی کام میں مس
وائز ناسٹ مدد کرتی تھیں۔

(۱۸) یہ شعر اقبال کی نظم "زہد و رندی"، سے ماخوذ ہے، جو سب سے پہلی بار دسمبر ۱۹۰۲ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی اور پھر جزوی ترمیم کے بعد "بانگ درا" میں شامل کی گئی ہے۔ یہ نظم ضمیمے میں صفحہ ۶۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۹) انگریزی زبان کا مشہور شاعر (ولادت ۱۷۹۲ء وفات ۱۸۲۲ء)

(۲۰) جرمنی زبان کا مشہور شاعر جس کے مغربی دیوانوں کا جواب اقبال کا مجموعۂ کلام "پیام مشرق" ہے (ولادت ۱۷۴۹ء وفات ۱۸۳۲ء)

(۲۱) انگریزی زبان کا مشہور شاعر (ولادت ۱۷۸۸ء وفات ۱۸۲۴ء)

(۲۲) یہ نظم، جو بانگِ درا میں "وصال" کے عنوان سے شامل ہے، ضمیمہ میں صفحہ ۶۵ پر ملاحظہ ہو۔

(۲۳) (Murud) نواحِ بمبئی میں ایک چھوٹا سا ساحلی قصبہ۔

(۲۴) یورپ جانے سے پیشتر ہی اقبال گورنمنٹ کالج، لاہور میں فلسفے کے

پروفیسر ہو گئے تھے۔ انگلستان سے واپسی پر ملازمت کا یہ سلسلہ برقرار رہا اور اُن کی ماہانہ تنخواہ پانچ سو روپے ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اُنھیں وکالت کرنے کی بھی اجازت تھی۔

۲۵ اُس زمانے میں ریاست حیدرآباد کے وزیرِ خزانہ سر اکبر حیدری جو عطیہ فیضی کے قریبی عزیز تھے۔

۲۶ اقبالؔ کے شہرۂ آفاق اُستاد پروفیسر آرنلڈ جو قیامِ ہندوستان کے زمانے میں پہلے علی گڑھ کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ رہ چکے تھے۔

۲۷ اصل الفاظ یہ ہیں ('a dreamer of enquisite fancies')

۲۸ یہ نظم ضمیمہ میں صفحہ ۹۶ پر درج کی جا رہی ہے۔

۲۹ ملاحظہ ہو صفحہ ۵۲

۳۰ یہ اشعار ضمیمہ میں صفحہ ۹۷،۹۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔

ضمیمہ

وہ نظمیں جن کی طرف متنِ خطوط میں اشارے
کیے گئے ہیں۔ یا جن سے کوئی شعر ماخوذ ہے۔

زُہد و رندی

اک مولوی صاحب کی سُناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی

شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب اُن کا اعالی و ادانی

کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح سے الفاظ میں مضمر ہوں معانی

لبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہ میں کہیں دُردِ خیالِ ہمہ دانی

کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی

مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال کہ ہے قمریٔ شمشادِ معانی

پابندیٔ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سنی اسکی زبانی

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی

کچھ عار اُسے حُسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی

گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اِس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

لیکن یہ سُنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

مجموعۂ اضداد ہے اقبال نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے، طبیعت خفقانی

رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی

اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
تا دیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی

اس شہر میں جو بات ہو، اُڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سنی اپنے اَحبا کی زبانی

اک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی

فرمایا، شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی

میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا زرہِ قربِ مکانی

خم ہے سرِ تسلیم مرا آپ کے آگے
پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی

گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اُس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

(بحوالہ خط نمبر ۵)

وصال

جستجو جس گُل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گُل مجھے

خود تڑپتا تھا، چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں
تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا، شرماتا تھا میں

میرے پہلو میں دلِ مضطر نہ تھا، سیماب تھا
ارتکابِ جُرمِ الفت کے لیے بیتاب تھا

نامرادی محفلِ گُل میں مری مشہور تھی
صبح میری آئنہ دارِ شبِ دیجور تھی

از نفس در سینۂ خوں گشتہ نشتر داشتم
زیرِ خاموشی نہاں غوغائے محشر داشتم

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں
اہلِ گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں

عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے
کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے

غازۂ الفت سے یہ خاکِ سیہ آئینہ ہے
اور آئینے میں عکسِ ہمدمِ دیرینہ ہے

قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی
دل کے لُٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرا واسوختی

(بحوالہ خط نمبر ۵)

پھول کا تحفہ عطا ہونے پر

وہ مستِ ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے
کلی کلی کی زباں سے دُعا نکلتی ہے

"الٰہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے!
کلی سے رشکِ گلِ آفتاب مجھ کو کرے"

تجھے وہ شاخ سے توڑیں زہے نصیب ترے
تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب ترے

اٹھا کے صدمۂ فرقت وصال تک پہنچا
تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا

مرا کنول کہ تصدق ہیں جس پہ اہلِ نظر
مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر

کبھی یہ پھول ہم آغوشِ مُدّعا نہ ہوا
کسی کے دامنِ رنگیں سے آشنا نہ ہوا

شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے
فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے

(بحوالہ خط نمبر ۸)

دُعا

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرہ کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے، پھر ذوقِ تقاضا دے

محروم تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر
اِس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اِس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

آتش نفسی جس کی کانٹوں کو جلا ڈالے
اِس بادیہ پیما کو وہ آبلۂ پا دے

رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر
خودداریٔ ساحل دے، آزادیٔ دریا دے

اِس دَور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو
وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اُجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

(بحوالہ خط نمبر ۹)

نمودِ صبح

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر
منزلِ ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر

محفلِ قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت
دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت

چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغامِ حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرامِ حیات

مسلمِ خوابیدہ! اُٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ نکل آئی سحر! گرمِ تقاضا تو بھی ہو

دورۂ عالم میں رہ پیما ہو مثلِ آفتاب
دامنِ گردوں سے ناپیدا ہوں یہ داغِ سحاب

کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرمِ ستیز
پھر سکھا تاریکیٔ باطل کو آدابِ گریز

تو سراپا نور ہے، زیبا ہے عریانی تجھے
اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے

ہاں نمایاں ہو کے برقِ دیدۂ خفاش ہو
اے دلِ کون و مکاں کے رازِ مضمر فاش ہو

(بحوالہ خط نمبر ۹)

تصاویر

فیضی رحمان: عطیہ کے شوہر

عطیہ

پروفیسر آرنلڈ

مس وا ارنسٹ

والدہ اقبال: امام بی بی

Imam Bibi (Mother - Allama Iqbal)

والدِ اقبال: شیخ نور محمد

زوجہ اقبال مختار بیگم

مس سروجنی نائیڈو

ہمشیرہ عطیہ نازلی رفیعہ سلطانہ

زوجہ اقبال سردار بیگم

خطوطِ اقبال بنام عطیہ فیضی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

KURF

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش